حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانویؒ

وفات: ۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ (۱۵/ اپریل ۱۹۹۵ء)

حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کا انتقال ہوگیا، سننے میں یہ ایک مختصر سی خبر تھی، لیکن ایسا محسوس ہوا، جیسے دل ودماغ پر سناٹا چھا گیا ہو، بے ساختہ لبوں پر انا للہ وانا الیہ راجعون کی ربانی تسلی جاری ہوئی، مگر ذہن وخیال منجمد ہوکر رہ گیا۔ مولانا وحیدالزماں صاحب مرگئے؟ نہیں، میں مرگیا، دنیا مرگئی۔ اب کون بچا، صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ باقی ہے، ورنہ ہر ایک فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی لگا ایک لمحہ کے لئے! وہ لمحہ بہت مختصر تھا، مگر بڑا جاں گداز تھا، وحشت اثر تھا، پھر فکر وخیال میں حرکت آگئی، پھر دنیا حسب معمول چلنے لگی، سارا کاروبار زندگی، جو یک لخت بند ہوگیا تھا، معمول پر آگیا۔ جیسے کچھ نہ ہوا ہو، وہی بھاگ دوڑ، وہی حرکت وعمل، وہی خورد ونوش، وہی غفلت وسرمستی! تو کیا واقعی کچھ نہیں ہوا؟ کوئی حادثہ نہیں ہوا؟

انسان بھی عجیب شے ہے، ایک خبر سنتا ہے، غمزدہ ہوجاتا ہے، دنیا تاریک ہوجاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے، کہ یہ غم ہمیشہ تازہ اور یہ دنیا ہمیشہ تاریک رہے گی، یہ زخم سدا ہرا رہے گا، لیکن وقت کی رفتار آگے بڑھ جاتی ہے، اور آدمی نئی چیزوں، نئے سامانوں، نئے قصوں میں پچھلے حادثہ کو فراموش کردیتا ہے، زخم کا صرف داغ باقی رہ جاتا ہے، درد کافور ہوجاتا ہے۔

مولانا وحیدالزماں صاحب کی رحلت کی خبر سنی تو اچانک نبض دوراں رکتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن جب وہ رواں ہوئی تو میرے فکر وخیال کا دھارا یک بہ یک پیچھے کی طرف مڑ گیا، مجھے وہ باتیں اور وہ زمانہ یاد آنے لگا، جس نے مولانا وحیدالزماں صاحب کو ہم طالب

علموں کے دل کی دھڑکن بنا دیا تھا۔ وہ ہمارے ذہن ودماغ پر، فکر وخیال بن کر چھا گئے تھے، میں نے انھیں اس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ مگر تصور میں ان کی تصویر کے خاکے بنایا کرتا تھا۔

میں عربی کی ابتدائی جماعت کا طالب علم تھا، اساتذہ تمرین کے لئے اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا کرتے تھے، میں ایک کمزور طالب علم تھا، غلطیاں بہت ہوتی تھیں، اساتذہ کی ڈانٹ سنا کرتا تھا۔ مجھے تلاش تھی کہ کوئی ایسا لغت ملتا، جس کی مدد سے اردو کا ترجمہ عربی میں بخوبی کرسکتا۔ ایک کتاب ملی، مگر میں اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکا۔

پھر ایک دوسری کتاب چھوٹی سائز کی کسی قدر باریک کتابت والی میں نے اپنے ایک شفیق استاذ کے پاس دیکھی، اس پر نام ''القاموس الجدید'' لکھا تھا، الٹ پلٹ کر دیکھا، تو بہت اچھی معلوم ہوئی، مصنف کا نام مولانا وحید الزماں کیرانوی تھا۔ یہیں سے مولانا سے واقفیت کی بنیاد پڑی، اپنی استعداد کے بقدر اس سے استفادہ کرتا رہا، اس کی ضرورت اُردو عربی انشاء میں ہوتی تھی، اور مجھے اس سے مناسبت بہت کم تھی، اس لئے استفادے کی نوبت کم آتی تھی، پھر دارالعلوم دیوبند سے مولانا کی ادارت میں ایک عربی مجلّہ ''دعوۃ الحق'' نکلنا شروع ہوا، طلبہ کی انجمن میں بھی وہ آتا تھا، خوبصورت، دیدہ زیب ٹائٹل، مدیر کے حسن ذوق کا آئینہ دار! ایک تو دارالعلوم دیوبند سے عقیدت، دوسرے مدیر رسالہ کی عظمت، بڑے شوق سے اس کا حرف حرف پڑھا جاتا، گو کہ اس کا بڑا حصہ ہماری دسترس سے باہر ہوتا مگر شوق ومحبت کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

پھر اچانک طبیعت کا رُخ بدلا، کہاں تو عربی انشاء وتکلم سے کوئی مناسبت نہ تھی، اور کہاں اب یہ حال ہوا کہ ہمہ وقت اسی کی دھن رہنے لگی، ایک کتب خانہ والے سے فرمائش کی کہ دیوبند سے ''القاموس الجدید'' اردو سے عربی منگوا دیجئے، انھوں نے منگوائی ضرور، مگر اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ ضخامت بھی کچھ زیادہ تھی، جلد اس کی نہایت خوبصورت، طباعت بے حد نظر فروز! بچپن کا زمانہ، حسن وزیبائش پر طبیعت فریفتہ، دیر تک اس کا حسن وجمال ہی دیکھتا رہا، اور خوش ہوتا رہا، لیکن یہ خوشی یک لخت کافور ہوگئی، جب بجائے اردو

سے عربی کے دیکھا تو عربی سے اردو کا وہ لغت تھا، یا اللہ اب کیا کروں؟ مجھے تو اردو سے عربی
بں ترجمہ کی مشق کرنی تھی۔ مگر اب کیا کرتا، اسی کو اتنا دہرایا کہ تقریباً پوری کتاب حفظ ہوگئی۔

پھر ۱۳۸۸ھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے دیوبند پہونچادیا، امتحان داخلہ مولانا وحید
زماں صاحب کے پاس تجویز ہوا، جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم کے امتحان داخلہ کا
نظر قیامت صغریٰ کا نمونہ ہوتا ہے، نئے نئے طلبہ! دارالعلوم دیوبند کی ہیبت اور اس کا جلال!
ساتذۂ دارالعلوم کی عظمت وشوکت! امید وبیم کی ایسی کشمکش ہوتی ہے کہ ان دنوں گردش ایام
کا بھی پتہ نہیں چلتا، اب تو وہاں امتحانات داخلہ تحریری ہونے لگے ہیں، اس وقت تقریری
متحانات ہوتے تھے، دارالحدیث میں مختلف اساتذہ، تپائیوں کے حصار میں بیٹھے ہوتے،
کتابیں ان تپائیوں پر رکھی ہوتیں، چپراسی طالب علم کا نام لے کر پکارتا، طالب علم بے چارہ
راسہما حاضر ہوتا، کچھ دیر امتحان کی جانکنی میں مبتلا رہتا، پھر واپس ہوجاتا، اس کے بعد نمبر
علوم کرنے کی بے قراری ہوتی۔

اساتذہ مختلف رنگ طبائع کے تھے، بعض امتحان میں نرم ہوتے، ہر طالب علم چاہتا
کہ اس کا امتحان انھیں کے پاس ہو، بعض اصول کے نہایت پابند، اور قواعد کو پوری طرح
رتنے والے، ان کے پاس جانے سے ہر ایک گھبراتا اور کتراتا، ایسے حضرات کے پاس کم
ی خوش قسمت کامیاب ہوتے۔

معلوم ہوا کہ اساتذۂ دارالعلوم میں امتحان کے باب میں بااصول لوگوں کی صف
بں ممتاز ترین نام مولانا وحید الزماں صاحب کا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ میرا امتحان
اخلہ مولانا ہی کے سپرد ہوا، میرے بعض پرانے رفقاء نے بہت محنت کی کہ میرا امتحان وہاں
سے دوسری جگہ منتقل ہوجائے، اور اس کے واسطے دو دو مرتبہ پکار کے باوجود مجھے حاضر نہیں
ونے دیا۔ مگر جب ان کی کوشش ناکام ہوگئی، اور بالآخر میں مولانا کی خدمت میں حاضر

مطلب سمجھایئے، جس طرح ہوسکا اس کی بھی تعمیل کردی، پھر دیوان متنبّی کھولنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ ایک جگہ سے چند اشعار پڑھوائے، ترجمہ اور مطلب دریافت کیا، ایک لفظ پر تھوڑی سی بحث بھی ہوگئی۔ میں نے جو مطلب بتایا، مولانا نے اسے قبول نہیں کیا، میں مصر ہوگیا، مولانا سمجھا رہے تھے اور مجھ پر حماقت سوار تھی، میں اپنے بیان کئے ہوئے معنیٰ کیلئے دلائل دینے لگا۔ مولانا انھیں رد کررہے تھے، اور میں الجھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ بجائے ناراض ہونے کے مولانا خوش ہورہے ہیں، چہرہ پر بشاشت اور لہجہ میں شفقت بڑھتی جارہی ہے، آنکھوں میں تلطُّف کی ایک خاص چمک محسوس ہونے لگی، پھر ایک جگہ سے دس اشعار پڑھوائے، اور امتحان ختم ہوگیا۔ یہ سارا معاملہ بمشکل دس منٹ میں تمام ہوگیا، لطف کے جن الفاظ اور کرم کے جس لہجے میں مولانا نے واپسی کا حکم دیا، اسی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ امتحان میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں ہے، چنانچہ جب نتیجہ معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ صرف کامیابی کی سند ہی مولانا نے نہیں دی ہے بلکہ امتیازی نمبر عطا کئے ہیں۔

چند دنوں میں اسباق شروع ہونے والے تھے، مولانا اس زمانہ میں عربی تکلم وانشاء کے شائق طلبہ کو خود پڑھاتے تھے، اور اس کیلئے بڑی مشقت برداشت کرتے تھے، خود ہی اسباق تیار کرتے، اور انھیں اپنے خاص انداز میں پڑھاتے، انھیں اسباق کا مجموعہ بعد میں ''القرأة الواضحة '' کے نام سے متعدد اجزاء میں شائع ہوا، ان سے پڑھنے کی ہر طالب علم ہمت بھی نہیں کرتا تھا، کیوں کہ وہ جہاں خود لگن سے کام کرتے تھے، اسی طرح طلبہ سے بھی کام لیتے تھے، اس وقت انھوں نے تین درجے قائم کرر کھے تھے، صف اول، صف ثانی، صف نہائی، صف اول بالکل ابتدائی درجہ تھا، اس کی تعلیم کے لئے کبھی کبھی صف نہائی کے ممتاز طلبہ سے کام لیتے تھے، صف نہائی آخری درجہ تھا، اس میں شریک ہونے والے طلبہ عموماً عربی لکھنے اور بولنے پر بے تکلف قادر ہوجاتے تھے، نئے طلبہ عموماً صف اول میں داخلہ حاصل کرپاتے تھے، میں نے جرأت کی اور دفتر تعلیمات میں درخواست گزاری کہ میرا داخلہ صف ثانوی میں کرلیا جائے، حکم ہوا کہ مولانا سے اس پر منظوری لکھوا کر لاؤ، میں ڈرتے

ڈرتے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، انھیں میرا امتحان یاد تھا، دیکھتے ہی پہچان گئے، اور میری درخواست پر ایسے کلمات تحریر فرمائے جو ہر اعتبار سے میری حیثیت سے بہت بلند تھے، اور آج بھی ان الفاظ کو سوچتا ہوں تو شرماتا ہوں کہ مولانا نے کیا حسن ظن ظاہر فرمایا اور میں کس پستی میں پڑا ہوا ہوں۔

صف ثانوی کے اسباق نماز مغرب کے بعد ہوتے تھے، چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز درسگاہ میں بیٹھتے ہی فرمایا کہ آج کل میں جس نے بھی کوئی سفر کیا ہو اس کی روداد کھڑے ہو کر عربی میں بیان کرے۔ قدیم طلبہ دو چار دن کے اندر مدرسہ میں حاضر ہوئے تھے اس غیر متوقع حکم سے سب سراسیمہ ہو گئے، ہم جیسے طالب علموں کے لئے مجمع عام میں اردو میں چند منٹ بولنا مشکل تھا، عربی میں اس طرح بولنا تو اس وقت تک سوچا بھی نہ تھا، سب خاموش تھے۔ اور مولانا اسی حکم کو مکرر دہرا رہے تھے، ۷۰ر طلبہ کی جماعت تھی، زیادہ تر قدیم طلبہ تھے، چار پانچ جدید طالب علم تھے، میں سدا کا ناعاقبت اندیش، تھوڑا سا انتظار قدیم طلبہ کا کیا کہ وہ سال بھر مولانا کی صحبت میں مشق وتمرین سے مستفید ہو چکے تھے، اور میری جو کچھ مشق تھی بغیر کسی استاذ کے تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی کھڑا نہیں ہوا، تو میں نے ہمت کر ڈالی۔ دو روز پہلے سہارن پور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دی تھی، اسی سفر کی داستان کٹے پھٹے الفاظ میں اٹکتے بھٹکتے، ہکلاتے رکتے بیان کرتا رہا، اور اخیر میں بے اختیار میری زبان سے نکلا رَجَعْتُ مِنهَا وَقْتَ الشَّامِ شام کے لفظ پر طلبہ کا ایک لطیف سا قہقہہ درسگاہ میں گونج گیا۔ میں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محفل قہقہہ زار کیوں بن گئی، لیکن معاً مولانا کی گرجدار آواز سنائی دی، انھوں نے ہنسنے والوں کو تنبیہ کی اور بولنے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی، مولانا کی گفتگو سے احساس ہوا کہ غلطی کیا تھی۔

مولانا کا دستور عموماً یہی تھا کہ وہ طالب علموں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر زیادہ نظر نہیں رکھتے تھے، اور نہ ان پر بہت زیادہ زجر وتوبیخ کرتے تھے، اور نہ ان کی وجہ سے کسی کو حقیر

سمجھتے تھے، وہ ان کی خفتہ صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے تھے، انھیں بیدار کرنے کی تدبیریں کرتے، کمزوروں کو ہمت دلاتے، ہمت والوں کی حوصلہ افزائی کرتے، طالب علموں کو بے تکلف کر کے استفادے کی راہ کشادہ اور آسان کرتے، ان کے پاس جا کر ان کی باتیں سن کر، طالب علموں میں کام کی لگن، پڑھنے لکھنے کی دھن اور محنت و کوشش کی آگ بھڑک اٹھتی، کمزور سے کمزور طالب علم یہ سمجھ کر ان کے یہاں سے اٹھتا کہ میں بھی کچھ کرسکتا ہوں، وہ اس طریقہ سے طلبہ کو بہت جلد ترقی کی راہ پر لگا دیتے، نئے طلبہ جو ابتداءً دارالعلوم میں ڈرے سہمے رہتے، دبتے اور جھجھکتے رہتے۔ مولانا ان کی جھجھک بڑے خوبصورت انداز میں دور کرتے۔

تعلیم شروع ہو چکی تھی، ایک روز مجلسی گفتگو میں انھوں نے چند طلبہ کو ترغیب دی کہ بدھ کے روز شام کو سب لوگ اپنا اپنا کھانا لے کر ان کے کمرے میں پہونچ جائیں اور سب مل کر کھانا کھائیں، یہ چار پانچ طالب علم تھے، ہم لوگ ہر بدھ کو حاضر ہوتے، مولانا کے ساتھ کھانا کھاتے، کھانے کا سلیقہ سیکھتے، دستر خوان کے آداب کیسے برتے جاتے ہیں؟ مولانا ہمیں سکھاتے، اس نجی مجلس میں طلبہ بے تکلف ہوتے، اور مولانا سے قرب و محبت کا احساس ہوتا، مولانا اس مجلسی گفتگو میں طلبہ میں ایک عجیب علمی و عملی لگن پیدا کر دیتے، مولانا بہت نازک مزاج تھے، مگر نہ جانے صبر وضبط کا کون سا پتھر اپنی نازک مزاجی پر رکھ لیتے کہ ہم لوگوں کے گنوار پن پر بھی کوئی تغیر نہ محسوس ہوتا، کھانے کے بعد مولانا خود چائے بناتے، نہایت نفاست کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ ہر ایک کو پلاتے، پینے کا طریقہ سکھاتے، اور لطف وعنایت کی باتیں کرتے جاتے۔

عصر کی نماز کے بعد تفریح کیلئے جاتے، دو چار طلبہ اس میں بھی ساتھ ہو جاتے، عربی میں گفتگو ہوتی، ساتھ والے طلبہ اس سے بہت فائدہ اٹھاتے، تفریح میں ساتھ جانے کی سعادت مجھے دو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں حاصل ہوئی، البتہ مجلس طعام میں پابندی سے شرکت ہوتی۔

ایک بار مولانا کو اندازہ ہوا کہ پڑھنے لکھنے کے باب میں عموماً طلبہ میں سستی آچلی

ہے، اچانک خبر پھیلی کہ دارالحدیث میں مولانا طلبہ کو خطاب فرمائیں گے، بجلی کی طرح یہ خبر سارے دارالعلوم میں کوندگئی، غالباً مغرب بعد کا وقت تھا، جو جہاں سے اس خبر کو سنتا، وہیں سے دارالحدیث کی طرف پلٹ پڑتا۔ میں اب تک مولانا کے درس میں شریک ہوا تھا، جس میں زیادہ گفتگو عربی میں ہوتی، یا مجلس طعام میں جس میں سب کو بولنے کی اجازت ہوتی، لیکن مولانا خطیب بھی ہیں، اس کی خبر نہ تھی، مولانا کا خطاب سننے کے لئے طلبہ بے تحاشا لپکے جارہے تھے اس سے مولانا کی محبوبیت ومقبولیتِ بے حد کا اندازہ ہورہا تھا اور یہ بات تو معلوم تھی ہی کہ مولانا کی مقبولیت احاطۂ دارالعلوم میں اکثر اساتذہ سے بڑھ کر ہے، لیکن آج کیا خاص بات ہے کہ طلبہ اس تیزی کے ساتھ لپکے چلے جارہے ہیں، میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہوگیا، دارالحدیث میں پہونچا تو اس میں تِل رکھنے کی گنجائش نہ تھی، ایک دروازے پر کھڑے ہونے کی جگہ ملی، دیکھا کہ مولانا بھی تیزی سے چلے آرہے ہیں۔ چہرے پر جوش کے خاص آثار دکھائی دے رہے ہیں، نگاہوں میں گرمی ہے، مولانا کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ سارا بدن سمٹا ہوا، پُرسکون ہوتا لیکن رفتار ہوا جیسی ہوتی، دائیں بائیں کوئی جنبش نہ ہوتی، حتیٰ کہ ہاتھوں میں بھی حرکت نہ ہوتی، تیر کی طرح چلتے، سیدھے تخت پر آگئے، نہ کوئی تمہید نہ مقدمہ! آتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، اس جوش اور روانی کے ساتھ بول رہے تھے کہ سننے والوں کی سانسیں سینوں میں اٹک اٹک گئیں، الفاظ کا زیروبم، آواز کی گھن گرج، خطابت کا ایسا طوفانی جوش میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ پہاڑ کی بلندی پر سے پانی کا ریلا نہایت شدت کے ساتھ اتر رہا ہو اور اپنے ساتھ بڑی بڑی چٹانوں کو بہائے لئے جارہا ہو۔ ٹھیک اسی طرح مولانا کا جوشِ خطابت، طبیعتوں کی سردمہری، سستی وناکارگی، بے حوصلگی وبے ہمتی کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے چلا جارہا تھا، بمشکل پون گھنٹہ یہ خطاب ہوا تھا، لیکن سننے والوں کو محسوس ہوا کہ صدیوں کی گرانجانی ان پر سے اتر گئی ہو، دلوں میں حوصلہ کی حرارت بڑھ گئی، مقصد کیلئے انہماک اور دھن کا ولولہ جاگ اٹھا، دارالحدیث سے واپسی ہوئی تو ہر طالب علم بدلا ہوا نظر آیا۔

ایک بار خبر گرم ہوئی کہ ممالک عربیہ کے کچھ سفراء دارالعلوم کے معائنہ کے لئے آرہے ہیں، ان کے استقبال کے لئے دارالحدیث میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، یاد نہیں کتنے سفراء تھے مگر اسٹیج پر ایسا لگتا تھا کہ عربوں کی ایک دنیا اتر آئی ہو، ابتدائی کارروائی کے بعد صف نہائی کے ایک طالب علم کو تقریر کے لئے طلب کیا گیا، وہ آئے اور انھوں نے برجستہ فصیح و بلیغ عربی میں خالص عربی لب ولہجہ میں ارتجالاً تقریر کی، دارالعلوم کے سبھی اساتذہ وطلبہ اور اربابِ انتظام بے حد مسرور ہوئے، یہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی کاوش وکوشش کا ایک نمونہ تھا۔ یاد آتا ہے کہ کسی سفیر نے کچھ دیر تقریر کی، اخیر میں دارالعلوم دیوبند کے نامور مہتمم، ملک کے بے مثل خطیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حکیمانہ انداز میں ایک بلیغ تقریر کی، یہ تقریر اُردو میں تھی، اس لئے معزز مہمان اس سے مستفید نہ ہو سکے، مہتمم صاحب کی تقریر ختم ہوئی، اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ترجمہ کے لئے کھڑے ہو گئے، ایسا برجستہ، شستہ اور فصیح و بلیغ ترجمہ کیا، اور اتنی روانی اور خطیبانہ آہنگ کے ساتھ کیا کہ عام سامعین تو مبہوت تھے ہی عرب سفراء بھی مسحور ہو کر رہ گئے، ان کا حال یہ تھا کہ کبھی جھومنے لگتے، کبھی مولانا کا چہرہ تکتے، کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے، بے ساختہ **سبحان اللہ** کی صدا بلند ہوتی، مولانا کا خطاب تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اس کی قوت و جوشش بڑھتی جاتی تھی، آواز تھی کہ جادو جگا رہی تھی، شعلہ سا لپک رہا تھا، مضامین حضرت مہتمم صاحب کے نہایت بلند و بالا، ترجمہ عربی زبان میں، جس کی رزانت و جزالت کا جواب نہیں اور محوِ گل افشانی گفتار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب! جن کی خطابت بے مثال! بس سماں بندھ گیا، تقریر ختم ہوئی تو تمام مہمان کھڑے ہو گئے اور ایک صاحب جو ذرا ممتاز تھے، بے اختیار بغل گیر ہو گئے، وہ کچھ کہہ رہے تھے غالباً مولانا کو داد دے رہے تھے۔

مولانا کو دارالعلوم سے عشق تھا، دارالعلوم کی تعلیم، اس کی تربیت میں کچھ کمزوری اور کمی محسوس کرتے، تو بیتاب ہو جاتے، اور اپنے دائرۂ اختیار میں ہر ممکن کوشش اس کو دور کرنے کی کرتے، انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ نماز میں کچھ سست ہو رہے ہیں، گرمیوں کا موسم تھا،

رات گئے دیر تک طلبہ پڑھتے رہتے، رات چھوٹی ہوتی، سوتے اور نوجوانی کی نیند! سوتے ہی رہ جاتے، فجر کی جماعت میں حاضری کم ہوگئی تھی، مولانا نے اسے محسوس کیا اور دارالاقاموں کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ مولانا وحید الزماں جس طوفانی وجود کا نام تھا، ممکن نہ تھا کہ جس طرف سے وہ گزر جائیں، کوئی بستر پر پڑا رہ جائے، حالانکہ وہ نہ ڈانٹتے نہ مارتے، بس ان کی ہیبت، ان کا جلال اور ان کی محبت ایسی تھی کہ ہر ایک کو خوابِ راحت سے جگاتی، بستر استراحت سے اٹھاتی اور مسجد تک پہونچاتی چلی جاتی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے فجر کی نماز میں پچھڑ جانے والوں کو جگہ ملنی مشکل ہو جاتی، نہ جانے کیا جادو تھا ان کی شخصیت میں!

دارالعلوم دیوبند کا موضوع علمی و تعلیمی اعتبار سے قرآن وحدیث اور فقہ ہے، اور عملاً ایسے رجال کار تیار کرنا جو اسلام، ایمان اور احسان تینوں شانوں کے جامع ہوں تاکہ شریعت اسلامی کامل طور پر ان کی صورت وسیرت میں اور ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہو، وہ عالم باعمل ہوں، اور دیکھنے والوں کے لئے دین اسلام کے حسن و جمال کے مرقع ہوں، ان کو دیکھ کر اللہ یاد آئے، وہ ایسے مردِ مجاہد ہوں کہ اللہ کے نام پر، رسول ﷺ کے نام پر، دین و مذہب کے واسطے جان و مال کی بڑی سے بڑی قربانی دے کر، اپنے عجز و قصور کا اعتراف کریں، اور وہ ہر باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے مستعد ہوں۔ بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند ایسے رجال کار اور مردانِ راہ تیار کرنے میں کامیاب رہا۔ بالخصوص دارالعلوم کا قرنِ اول اور قرنِ ثانی اس سلسلہ کا عہد زریں ہے، اس دور میں اس نے ہمہ جہت علماء پیدا کئے، لیکن دارالعلوم پر ایک ایسی جہت سے اعتراض ہوتا رہا، جو دارالعلوم کا موضوع نہ تھا، وہ یہ کہ یہاں کے طلباء و علماء عربی انشاء پردازی اور عربی بولنے پر قدرت عموماً نہیں رکھتے، الزام یہ تھا کہ اتنے دنوں تک عربی پڑھنے پڑھانے کے باوجود اس زبان میں چند الفاظ بولنے ہوں یا کچھ لکھنا ہو تو یہ لوگ عاجز رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ندوہ نے پیش رفت کی تو یہ اعتراض اور نمایاں ہوگیا۔

دارالعلوم پر سے اس اعتراض کو جس نے اٹھایا، وہ مولانا وحید الزماں صاحب تھے، وہ جیسا کہ معلوم ہو چکا عربی زبان کے غیر معمولی قادر الکلام خطیب تھے، خالص عربی

لب ولہجہ میں جب وہ محوکلام ہوتے تو اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ وہ ہندوستانی ہیں یا عربی! اس سے بڑھ کران کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عجمی ماحول کو یکسر عربی میں تبدیل کردیا تھا، وہی جو کل تک عربی زبان کے حق میں گونگے تھے، آج ناطق وگویا ہوگئے، یہ ان کی تعلیم وتربیت کا کمال تھا کہ تھوڑی ہی مدت میں رنگِ میخانہ بدل گیا، آج دارالعلوم کے فیض یافتوں میں جہاں کہیں عربی تکلم وانشاء کا چرچا ہے، وہ سب انھیں کا بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض ہے۔

مولانا تعلیم وتربیت کے ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیت رکھتے تھے، تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا کام کرڈالنا ان کے لئے معمولی بات تھی، انتظام کے ہر شعبہ پر ان کی گرفت یکساں ہوتی، جن دنوں وہ دارالعلوم کے معاون مہتمم تھے وہاں کا ہر شعبہ حسنِ انتظام کا آئینہ دار تھا۔

مولانا کی خوبیاں بیان کرنے کیلئے دفتر درکار ہے، لکھنے والے کی نگاہ قاصر ہے، قلم کوتاہ ہے، مولانا سے کچھ لوگ ناراض بھی رہے، مگر مولانا اپنی دھن کے پکے تھے، جس کو صحیح سمجھا، برملا کہا، اور صرف کہا نہیں، اسی راہ پر خود کو ڈال دیا، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، بشری خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

(مجلہ المآثر مئو [سہ ماہی] اکتوبر تا دسمبر ١٩٩٥ء، ص: ٨٢)

☆☆☆☆☆